مولانا ہاشمی، یادوں کے آئینے میں

مولانا عزیز الحسن صدیقی
(مہتمم مدرسہ دینیہ غازیپور، انڈیا)

لاہور والوں نے ۱۰/جنوری ۱۹۹۲ء کو ایک بیش قیمت ہیرا منوں مٹی کے نیچے دفن کردیا۔ یہ ہیرا مدتوں غازیپور کے کھنڈرات میں پڑا رہا جس کی غازیپور والوں نے قدر کم کی اس لئے دہلی والے اس کو شوق کے ہاتھوں لے گئے، کچھ عرصے تک اپنے پاس رکھا مگر اس کی اصل قیمت وہ بھی نہ پہچان سکے۔ پھر یہ ہیرا کسی طرح مشرقی پاکستان کے شہر سید پور منتقل ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس دھرتی پر آگ و خون کا ایسا سیلاب آیا جو انسانیت، شرافت اور اخلاق سب کچھ بہا لے گیا۔ وہ لوگ جو اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے تھے، نمازیں بھی پڑھتے تھے، دین پر مر مٹنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، جن کے کانوں تک اللہ کا فرمان۔

وَمَن يَقتُل مؤمناً مّتَعَمداً فجزاؤه جهَنّمُ خالداً فيهَا وَ غَضبَ اللهُ عَلَيه وَلَعنَهُ وَاَعدَلَهُ عذَاباًعَظيماً (النساء : ۹۳)

پہنچ چکا تھا مگر اس کو انھوں نے پس پشت ڈال کر ایک دوسرے کو پچھاڑ کھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اللہ کا غضب مول لیا۔ ایسے ہنگامہ رستخیز میں کِسے ہوش تھا جو جوہر قابل کو تلاش کرتا اور سنبھال کر رکھتا۔ جوہر بچا نہ جوہر شناس، بالآخر یہ نایاب ہیرا لاہور کے جوہر شناسوں کے ہاتھ لگا، جنھوں نے اسکی خوب ہی قدر کی۔ آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا دل میں جگہ دی۔ مشہور ہے جوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری، لاہور میں اس کی دونوں نے ہی قدر کی۔ لاہور صدیوں سے انمول ہیرے جواہرات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ داتا گنج بخش رحمہ اللہ نے جس کی خاک کو آسمان کی رفعتیں بخشیں، مولانا احمد علی لاہوری نے جہاں علوم قرآن کی شمع روشن کی، شاعر مشرق نے جس کو اپنا مسکن بنایا، جہاں انجمن حمایت الاسلام کی بنیاد ڈالی گئی، جہاں سہ روزہ "زمزم" کے دفتر میں بیٹھ کر مولانا محمد عثمان

فارقلیط نے انقلاب انگیز مقالات سپرد قلم کئے اور قوم کو جگایا جن کے بارے میں مولانا عبد الماجد دریا بادی رحمہ اللہ نے لکھا ہے اگر اپنا بس چلتا تو امت کا محتسب اعلی کچھ دنوں کیلئے انہیں کو مقرر کر دیتا، معاندین اور مخالفین پر بڑی گرفتیں کرتے ہیں اور تعمیری حیثیت سے بڑی متوازن اور صائب رائیں رکھتے ہیں۔ ان کے مقالے پڑھ پڑھ کر مثنوی رومی رحمہ اللہ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

در جگر افتادہ ، بستم صد شرر
در مقالاتم ببیں خون جگر

جہاں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اپنے شاگرد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی، میاں شیر محمد شمر قپوری رحمہ اللہ نے فانوس ہدایت روشن کی، اسی لاہوری میں ایک دو برس نہیں بیس برسوں تک یہ لعل شب چراغ چمکتا رہا۔

آپ نے سنا ہوگا، جب لوگ کسی بہت اچھے آدمی کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں " فلاں شخص تو ہیرا ہے " اس لئے ہم اگر کہیں کہ ہم جس ہیرے کی تعریف و توصیف کر رہے ہیں وہ پتھر کا نہیں بلکہ گوشت و پوست کا بنا ہوا تھا تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری مراد اس ہیرے سے مولانا سید محمد متین ہاشمی کی ذات گرامی ہے ۔ مولانا متین ہاشمی نے ۱۹۲۷ء میں غازیپور کے ایک ممتاز و متمول گھرانے میں آنکھیں کھولیں، نازو نعم میں پلے، چاندی کے کٹورے میں دودھ پیا۔ انکے والد سید حسین مختار وکالت کرتے تھے بعد میں وکالت کا پیشہ ترک کر کے ہومیو پیتھک کی پریکٹس شروع کردی تھی، محلہ لنگاہ میں گوخانے کے پاس ان کی حویلی ایک طویل و عریض چار دیواری کے اندر واقع تھی ایک پائیں باغ بھی تھا، ایک گوشہ میں متعدد حجرے ان طلبہ کے لئے بنے ہوئے تھے جو شہر کے مختلف مدرسوں میں پڑھا کرتے تھے، طلبہ کی کفالت بھی صاحب خانہ کے ذمہ تھی۔

سید حسین صاحب کی ساری اولادیں اور خاندان کے سبھی بچے ہوش سنبھالتے ہی اسکول میں داخل کر دیئے جاتے تھے ایک مولانا ھاشمی ہی ایسے تھے جنہیں خاندانی رواج کے خلاف مدرسہ میں بیٹھایا گیا۔ مدرسے غازیپور میں کئی ایک تھے مگر ان کی تعلیم کیلئے انتخاب مدرسہ دینیہ کا کیا گیا جس کا الحاق بورڈ سے تھا نہ کسی ریاست کی سرپرستی ہی اسکو حاصل تھی۔ یہ مدرسہ بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے مسلک پر گامزن تھا اور اب

بھی ہے۔ اس کے مہتمم مولانا محمد عمر فاروق تھے جو مولانا مدنی اور مولانا تھانوی کے صحبت یافتہ تھے، صدر مدرس مولانا ابوالحسن صدیقی تھے جو شمار دیوبند کے مایہ ناز فضلاء اور عربی کے بڑے اسکالروں میں ہوتا تھا۔ یہ مدرسہ اگر ایک طرف درس نظامی کی معیاری درس گاہ تھا تو دوسری طرف قومی تحریکات کا مرکز بھی تھا، جہاں مجاہد علماء آتے رہتے تھے جن کا اثر اس مدرسہ پر تھا، جہاں طوق و سلاسل کی جھنکاریں بھی سننے میں آتی تھیں، جہاں ملی سیاسیات کے چرچے بھی ہوا کرتے تھے، مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور عقائد کی درستگی کی فکر بھی ہوتی تھی، باطل تحریکوں کے خلاف صف آرائیاور ان سے نبرد آزمائی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ ایسے ماحول میں اخاذ ذہن رکھنے والامتین ہاشمی دین متین کا کتنا بڑا خادم اور ملت مسلمہ کا کتنا بڑا ہمدرد و بہی خواہ بن سکتا تھا، اس کا اندازہ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

مولانا ھاشمی کو مدرسہ میں داخلہ کیلئے تو ان کے والد ہی لے کر آئے ہوں گے مگر یہ بات وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ ان کو دین کی تعلیم کیلئے وقف کرنے کا خیال اولاً انکی والدہ ہی کے دل میں آیا۔ مرحومہ ایک دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے سب سے ذہین و فطین بیٹے محمد متین کو عالم دین بنانے کے ارادے سے باضابطہ طور پر مدرسہ میں داخل کرایا۔ ذہانت وفطانت ورثہ میں ملی تھی، تھوڑے ہی عرصے میں اساتذہ کے منظور نظر بن گئے اور فارسی کے ابتدائی درجے سے لے عربی کی پانچویں جماعت تک اسی مدرسہ میں پڑھا اور تکمیل کیلئے دیوبند بھیج دئے گئے۔ وہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، اپنی ذہانت کا سکہ وہاں بھی جمایا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تو ان کی صلاحیت پر نکھار آگیا۔

۱۹۴۶ء میں وہ دیو بند سے فارغ ہو کر وطن لوٹ آئے اور چار پانچ برسوں تک یہیں رہے اس عرصے میں انہوں نے الہ آباد عربی فارسی بورڈ کے کئی امتحانات دے ڈالے۔ انکے چچا سید محسن مرحوم انگریزی کے اچھے خاصے ادیب اور صحافی تھے، انگریزی کے پہلے مسلم ہفت روزہ "میسیج" دہلی میں برابران کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ان ہی سے انگریزی پڑھی اور ہائی سکول سے بی۔اے تک کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ غازیپور ضلع کے مشہور قصبہ یوسف پور میں حکیم عبد الوہاب انصاری معروف بہ حکیم نابینا (متوفی ۱۹۴۱ء) کے قائم کردہ مدرسہ، مدرسہ انصاریہ "میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہاں رہ کر تعلیم و تدریس کے

ساتھ حکیم محمد احسن انصاری مرحوم سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ یوسف پور کے زمانۂ قیام میں روزنامہ "الجمعیت" دہلی کیلئے مضامین ومراسلات لکھتے رہے۔ پھر ۱۹۵۱ء میں مدرسہ انصاریہ کی ملازمت ترک کر کے دہلی چلے گئے۔ ان ہی دنوں مولانا عبدالوحید صدیقی غازیپوری نے جوایک کہنہ مشق صحافی ہی نہیں مربی صحافت بھی تھے دہلی سے اردو کا ایک نیا اخبار "نئی دنیا" کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا، اسی اخبار میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اور روزناموں کے ایڈیٹروں کو پڑھنے کی مہلت کہاں ملتی ہے۔ ان کا قلم تو مزدور کے پھاوڑے کی طرح چلتا رہتا ہے لیکن مولانا ھاشمی نے زیادہ پڑھنے اور کم لکھنے کی عادت ڈالی جس کی وجہ سے ان کے قلم میں جلا اور روانی پیدا ہو گئی۔

دہلی میں رہ کر انہوں نے کتابیں ہی نہیں انسانوں کو بھی پڑھنے کی کوشش کی انکی ایک بابی یہ بھی تھی کہ فرصت کے اوقات میں بڑے بڑے لیڈروں سے ملنے کوشش کرتے۔ مولانا ابو الکلام آزاد سے ملنے کیلئے کئی بار ان کی کوٹھی پر پہنچے، مولانا کے پرائویٹ سکریٹری اجمل خان تھے جو سکریٹری کم اور داروغہ زیادہ تھے۔ بھلا کب ایک اجنبی اور نوجوان مولوی کو مولانا کی بارگاہ تک پہنچنے دیتے۔ اجمل خان ایک ایسے حصار کا نام تھا جس کو توڑنا آسان کام نہ تھا۔ مگر مولانا ھاشمی نے اس خوبصورتی سے اس حصار کو توڑا کہ خود اجمل خان کو بھی پتہ نہ چل سکا۔ انہوں نے اجمل خان سے ایک دو ملاقاتوں میں دوستی کرلی بس کام آسان ہو گیا۔ ایک دن وہ اجمل خاں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اسی وقت ایک ضعیف العمر بزرگ بوسیدہ سی شیروانی پہنے داخل ہوئے۔ اجمل خاں نے فوراً ہی پروانہ راہداری دیا اور وہ مولانا کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بزرگ واپس آئے اور اجمل خاں کی طرف ایک کتاب بڑھائی اور چلے گئے۔ مولانا ھاشمی نے اجمل خان سے پوچھا کہ کون صاحب تھے اور کیسی کتاب دے کر واپس جا رہے ہیں؟ اجمل خاں نے بتایا کہ بے چارے غربت زدہ ہیں بیٹی کی شادی کیلئے ان کے پاس پیسے نہیں ہیں اس سے پہلے بھی ایک بار وہ مولانا سے ملنے آئے تھے، اس وقت مولانا نے کہا تھا کہ آپ نے کوئی کتاب لکھی ہو تو لائیے، اس کی رائلٹی وزارت تعلیم سے دلوادی جائے گی۔ اسی غرض سے آئے تھے۔

دہلی مولانا ہاشمی کی آخری منزل نہ تھی، انہیں اور آگے جانا تھا، وہ دہلی سے ۱۹۵۳ء میں سید پور چلے گئے، جہاں کسی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ملازم تو کالج کے تھے مگر فرصت

کے اوقات میں دینی تعلیم، اصلاح معاشرہ، ملی سیاست جیسے امور میں بھی حصہ لیا کرتے، کسی مسجد میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کر رہے ہیں تو کسی جلسہ میں سامعین کے دلوں کو پند و نصائح سے گرما رہے ہیں۔ فضلاء دیوبند کی ایک خصوصیت جو دوسری درسگاہوں کے فضلا سے انہیں ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ جہاں بھی رہتے ہیں بیدار اور متحرک رہتے ہیں، یہ مدرسہ میں بیٹھ کر قال اللہ اور قال الرسول کا درس دے رہے ہوں گے مگر جب کوئی قومی اور ملی ضرورت یا مسئلہ پیش آجائے گا تو کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔

مولانا ہاشمی نے دارالعلوم سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ ملت کی امانت تھی اس کے وہ تنہا اجارہ دار نہیں تھے۔ اس امانت کو دوسروں تک پہنچانے میں انہوں نے بخل سے کام نہیں لیا۔ جہاں رہے علم کی سوغات بانٹتے رہے۔ اسی جذبے سے انہوں نے سید پور میں ایک دینی مدرسہ، جامعہ اسلامیہ کے نام سے قائم کیا تھا

۱۹۷۲ء میں وہ لاہور منتقل ہوگئے۔ لاہور کے ابتداء قیام کا زمانہ ان پر بہت سخت گزرا لیکن کیا مجال کہ جبین ہمت و استقلال پر ذرا سی بھی شکن آئی ہو۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے لکھنے کا شغل شروع کر دیا۔ جوہر کھلنے کی دیر تھی پھر علماء اور عوام دونوں ہی نے ہاتھوں ہاتھ لیا، فرصت کے اوقات سمٹنے لگے، مصروفیات بڑھتی گئیں، خلوت کی جگہ جلوت نے لے لی، لاہور کے مشہور علمی ادارے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے ریسرچ سیل کے ڈائریکٹر بنا دئے گئے۔ اپنے عہد میں انہوں نے اس شعبہ کو خوب ترقی دی، نہ جانے کتنی قدیم کتابوں کو زیور طبع سے آراستہ کر کے قدر دانوں تک پہنچادیا۔ اسی ادارے سے ایک سہ ماہی مجلہ "منہاج" کے نام سے نکلتا ہے صوری و معنوی دونوں اعتبار سے ایک امتیازی مجلہ ہے، اس کی ادارت ان ہی نے سنبھال رکھی تھی۔

کسی ایک ذات میں ساری خوبیاں کہاں جمع ہوتی ہیں، کوئی مصنف ہے تو تصنیف و تالیف ہی میں منہمک ہے کوئی مقرر ہے تو اس کو وعظ و تقریر سے فرصت نہیں، کوئی میدان سیاست کا شہسوار ہے تو سیاست ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے مگر مولانا ہاشمی خم خانۂ قاسمی کے ایسے جُرعہ کش تھے جنہوں نے جام شریعت اور سندان عشق دونوں کو سنبھال رکھا تھا، مسند درس و تدریس پر متمکن تھے تو میدان خطابت کے شہسوار بھی تھے، تصنیف و

تالیف کے میدان میں بھی ان کی تگ وتاز برابر جاری رہی، سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی بنا رکھا تھا۔ صدر مملکت ہو کہ وزیر اعلیٰ سب ان کے حلقہ بگوش! ان کی تحریروں میں شوخی نہیں متانت تھی، شگفتگی اور روانی تھی، تاثیر تھی، وہ ایسے مالی تھے جو خود رو پودوں کو اکھاڑ کر نئی چمن بندی کرنے کا گر جانتا ہے۔ مزاج میں خشونت نام کو نہیں تھی، بیتے ہوئے دنوں کی کہانی اور آپ بیتی سنانے لگتے تو محسوس ہوتا کہ کوئی منجھا ہوا داستاں گو داستاں سنا رہا ہے۔

راقم الحروف جب ۱۹۸۸ء میں کراچی جاتے ہوئے انکا مہمان ہوا تو ان کو بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا پایا۔ فون پر اپنی آمد کی خبر دی تو خود گاڑی لے کر آفس تک آئے اور مجھے اپنے گھر لے آئے، پر تکلف کھانا کھلایا، بیماری اور کمزوری کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو رہا تھا مگر میری خاطر تواضع میں لگ گئے، بار بار گھر کے اندر جاتے، گھر والوں کو ہدایتیں دیتے اور پھر باہر آتے، کبھی میرے معمولات کے بارے میں پوچھتے، تھوڑی ہی دیر میں پان کی گلوریاں لئے چلے آتے اور بیٹھ کر باتیں کرتے، غازیپور اور غازیپور والوں کے حالات اور خیریت پوچھتے۔ اس دن میں نے ان کی طبیعت میں نشاط و سرخوشی کی جو کیفیت دیکھی اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ میں ان کی معذوری کو دیکھتا اور پھر ان کی چلت پھرت دیکھتا تو مجھے حیرت بھی ہوتی اور شرمندگی بھی، میں نے ان سے کہا کہ آپ سے بہت چھوٹا ہوں، آپ میری خاطر اتنی مشقت کیوں اٹھا رہے ہیں۔ کہنے لگے تمہاری خاطر نہیں اپنی خاطر اٹھا رہا ہوں اور چاہتا یہ ہوں کہ کسی طرح اپنے استاذ (میرے والد مولانا ابوالحسن صدیقی) کو منہ دکھانے کے لائق تو بن جاؤں۔ میں ان کی اس ادا پر سوجان سے قربان ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ تواضع، یہ انکساری، یہ سادگی و بے غرضی کس کی دین ہے دل نے کہا یہ فیضان ہے ان قدسی صفات بزرگوں کا جن کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہ کیا۔ یہ کارنامہ ہے اس جماعت کا جس نے جگہ جگہ علوم نبوت کے چراغ روشن کر دیئے، جن پر متین ہاشمی جیسے پروانے کل بھی نثار ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں اور انشاء اللہ تا قیام قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ایک عالم دین میں تواضع نہ ہو، خشیت نہ ہو، حلم نہ ہو، غم خواری و دلداری نہ ہو تو کس کام کا!!

کم سوادوں نے صرف روزے نماز ہی کو دین سمجھ رکھا ہے حالانکہ دین نام ہے اس ضابطۂ حیات کا جس میں عبادات کے ساتھ اخلاق، مخلوق خدا کی خدمت مظلوموں کی اعانت اور حمایت حق بھی شامل ہے۔

مولانا مرحوم کی تصانیف کی تعداد متعین کرنا مشکل ہے۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے اور جتنا لکھا ہے خوب لکھا ہے لیکن ان کی ایک بڑی تصنیف "سراج منیر" تھے۔ سراج منیر کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ انکے بڑے بیٹے کا نام ہے۔ جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا نے ان پر کتنی محنت کی ہوگی، اگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین نہ لیا ہوتا تو وہ مولانا کی ایسی یادگار ہوتے جو مولانا کے بعد پسماندگان کے دل کا سکون و قرار ہوتے۔ افسوس کہ ہلالِ بدر کامل بنتے ہی گہنا گیا۔ باپ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے ریسرچ سیل کا ڈائریکٹر تھا تو بیٹا ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر، ایسے لائق، فائق اور ہونہار بیٹے کی جدائی مولانا سے برداشت نہ ہوسکی، مریض تو تھے ہی، اس غم نے اور نڈھال کر دیا اور یہی غم ان کی موت کا سبب بن گیا۔ مولانا مرحوم نے تربیت اخلاق کے سلسلے میں ایک بالکل گمنام سے شیخ سے رجوع کیا۔ رہروانِ راہ سلوک و طریقت کا خیال ہے اور بالکل صحیح خیال ہے، کہ اصلاح باطن کیلئے کسی نامی گرامی اور ایسے شیخ کا دامن پکڑنا ضروری نہیں ہے جس کے مریدوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہو بلکہ جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور یہ اطمنان بھی کہ اس سے وابستہ ہونے کے بعد واقعی اصلاح ہوسکتی ہے بس اس سے تعلق پیدا کر لینا چاہیے۔

غازی پور میں مولوی فاروق نامی ایک بزرگ رہتے تھے جو عالم فاضل تو نہ تھے مگر مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ شاہ عبد الرحیم فضلی اعظمی ثم فیض آبادی کی تربیت و توجہ نے مرشد و ہادیٔ طریق بنا دیا تھا۔ مولانا مرحوم کو ان سے قلبی تعلق اور لگاؤ تھا اس لئے ان ہی سے بیعت ہوگئے۔ راقم الحروف کو ان بزرگ سے یک گونہ تعلق و عقیدت تھی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ ان کی مجلس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں سنی گئی۔ آخرت کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی، جب بھی ان سے ملا ان کی زبان سے یہی سنا زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دعا کرو ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔ موت کا ہمہ وقت استحضار رہتا تھا، اللہ والوں کی پہچان اس کے سوا کیا ہے؟

مولانا ہاشمی لاہور کے بہت صاف ستھرے علاقے میں ایک شاندار بنگلے میں رہتے تھے مگر مزاج مولویانہ و فقیرانہ تھا۔ وہ تصنیف و تالیف اور تقریر و تذکیر ہی نہیں کرتے تھے، عام انسانوں کی بھلائی اور قومی کاموں میں بھی شریک رہتے تھے، پانی پر دم کرتے اور تعویذ لکھتے

بھی دیکھا گیا، میری موجودگی میں ایک بوڑھا شخص دو نوجوانوں کے ساتھ دور کے کسی شہر سے ایسے وقت میں ان کے مکان پر پہنچا جبکہ ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی، بڑا نازک وقت تھا، دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی، انہوں نے فوراً گاڑی روک دی۔ ضرورت معلوم کی اور اشارے سے کہا کہ پیچھے پیچھے آؤ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دفتر کے احاطہ میں رکیں آنے والوں کو چائے پلائی اور ٹھہرانے کا انتظام کیا، آنے والا ان کا معتقد نہیں بلکہ کسی زمانہ میں ان کا مخالف رہ چکا تھا اس کا کوئی عزیز کسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ میں تو چلا آیا مگر اللہ ہی جانے وہ کتنے دن ان کے پاس رہا اور انہوں نے اس کی کس کس انداز میں دلداری اور حاجت روائی کی۔

غیروں کی امداد و اعانت میں جب ان کی یہ سرگرمی تھی تو اپنوں کیلئے اور اعزہ و اقارب کیلئے انہوں نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ ان کی یہی وہ اعلیٰ صفات تھیں جنہوں نے ان کو انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بے ہمہ و باہمہ کی عملی تفسیر تھے۔ ذوق تمنا نے داستان کو کافی طول دیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں محترم حافظ محمد سعد اللہ صاحب نائب مدیر "منہاج" کا دل سے شکریہ نہ ادا کروں جنہوں نے مجھے مولانا متین ہاشمی علیہ الرحمہ والرضوان کی شخصیت پر اپنے تاثرات قلمبند کرنے کی دعوت دی۔ اب میں اس مضمون کو مکمل کرتے ہوئے کہہ سکتا ہوں۔

ع۔ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

افسوس کہ برصغیر کا ایک نامور عالم دین دارالعلوم دیوبند کا مایہ ناز فرزند، عظیم محقق، صاحب قلم، شعلہ نوا خطیب اور مدبر رہنما ہم سے چھن گیا۔ رب کریم اس کی قبر پر رحمتوں کی بارش کرے۔ اعلیٰ مراتب سے نوازے۔ آمین۔